قانونی اصلاحات اور برصغیر کی مسلم خواتین

گیل مینالت *

تلخیص: زبیدہ جبین

برصغیر میں مسلمان ایک طویل عرصے سے آباد رہے ہیں۔ مگر یہ ایک ایسا معاشرہ تھا جس میں ہندو، مسلمان اور سکھ مذاہب کے لوگ باہم مل کر رہتے رہے ہیں۔ بعد ازاں انگریزوں کی آمد بھی ہوئی۔ گویا یہ ایک ایسا معاشرہ تھا جس میں تہذیبی، مذہبی اور ثقافتی تعدد یا تکثر (pluralism) پایا جاتا تھا۔ مگر غیر محسوس طور پر یہ روایتیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہو رہی تھیں۔ عورتوں کی اصلاح کا عنوان ہر معاشرے میں ایک اہم موضوع رہا ہے۔ برصغیر میں بھی عورتوں کی سماجی اصلاح کے لیے مسلمانوں اور ہندوؤں نے اپنی اپنی مذہبی اور سماجی ضروریات کے تحت اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ ہندوؤں کے راہنما اس کے لیے شاستر اور وید کی تعلیمات کو پیش نظر رکھتے جبکہ مسلمان قرآن کو، مگر مسلم مصلحین نے واضح کر دیا کہ مسلمان عورت کی سماجی اصلاح بہر حال ہندو عورت کی سماجی اصلاح سے مختلف چیز ہے۔

اس ملے جلے معاشرے کی وجہ سے برصغیر میں مسلم طرزِ زندگی اور ثقافت میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں، اُن کے اہم اور نمایاں اسباب تین ہیں:

۱۔ غیر ملکی حکمرانوں کے سیاسی اقتدار کے سبب زوال معاشرت۔

۲۔ جاگیردار اور فوجی موثر طبقے میں اختیارات کا ارتکاز۔

۳۔ مذہبی اقدار اور ثقافتی رویوں کے فروغ میں رکاوٹ اور بعد۔

مسلمانوں کے نزدیک یہ اسباب بھی سیاسی زوال کا نتیجہ تھے۔ اور شاہ ولی اللہ اور ان سے پہلے شیخ

---

*Gail Minault, "Women, Legal Reform and Muslim Identity", *Comparative Stadies of South Asia, Africa and the Middle East,* Vol. XVII, No. 2, 1997

احمد سرہندی بھی اس نتیجے تک پہنچے تھے کہ سیاسی زوال ہی مذہبی زوال کا سبب ہے۔ اس لیے انیسویں صدی کے اختتام تک یہ سمجھا جانے لگا کہ تہذیب وتمدن کی بحالی کے لیے سیاسی بالادستی نہایت ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جب تک عورتوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ نہ کیا جائے گا اُس وقت تک معاشرے میں پھیلی ہوئی بے بنیاد اور غیر مذہبی روایات، رسومات اور توہمات سے چھٹکارا نہ پایا جا سکے گا۔

انیسویں صدی کے اختتام تک یہ سمجھا جانے لگا کہ تہذیب وتمدن کی بحالی کے لیے سیاسی بالادستی نہایت ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جب تک عورتوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ نہ کیا جائے گا اُس وقت تک معاشرے میں پھیلی ہوئی بے بنیاد اور غیر مذہبی روایات، رسومات اور توہمات سے چھٹکارا نہ پایا جا سکے گا۔

کیونکہ عورتیں ہی ان رسومات کو جاری رکھتی ہیں اور پھر ان خرفات کے بُرے اثرات کا شکار بھی ہوتی ہیں۔ اور یہ برے اثرات اس حد تک پھیلتے ہیں کہ عورتیں اپنے مذہبی حقوق سے محروم رہتی ہیں اور سماجی حقوق سے ناواقف۔

اس سلسلے میں انیسویں صدی کے تین رہنماؤں سر سید احمد خان، مولانا اشرف علی تھانوی، اور سید ممتاز علی نے اپنے اصلاحی پروگرام میں عورتوں کے حوالے سے اصلاح وتربیت کو بالخصوص زیر بحث رکھا۔ اس سلسلے میں ان تینوں نے عورتوں کے لیے تعلیم کو بنیادی عنصر قرار دیا۔

ذیل میں ان تینوں مفکرین کے افکار اور سرگرمیوں کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

سر سید احمد خان (۱۸۱۷ء-۱۸۹۸ء)

سر سید احمد خان کو برصغیر میں تعلیمی اصلاح کا سرخیل سمجھا جاتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ مغربی تعلیم مسلمان مردوں کے لیے ضروری اور عورتوں کے لیے قبل از وقت ہے۔ تاہم وہ عورتوں کی گھریلو تعلیم کے حامی تھے۔ پردے کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ برصغیر میں اس رواج میں غیر ضروری چیزیں شامل کر دی گئی ہیں۔ عورتوں کے توہمات، رسومات اور رواج پر عمل درآمد کے باعث مردوں کی زندگی دوبھر ہو رہی

ہے۔اوراس کی اصل وجہ تعلیم سے دوری اوراسلام سے ناواقفیت ہے۔سر سید کے پر جوش ساتھیوں نے دلیل پیش کی کہ تعلیم کے ذریعے نہ صرف عورتوں کو جاہلانہ رسومات سے نجات ملے گی بلکہ وہ قومی زندگی میں شریک ہوکر اپنا کردار بھی ادا کرسکیں گی۔

مولانا اشرف علی تھانوی (۱۸۶۴ء-۱۹۴۳ء)

آپ بہت بڑے عالم دین ہیں۔اورآپ نے جہاں اُمّت کی اصلاحِ عام کا بیڑا اٹھایا، وہیں پر خواتین کی تعلیم، خانہ داری کی تربیت اور بے پناہ رسومات کے خاتمہ کی تحریک بھی چلائی، دینی تعلیم کو خواتین کی تربیت کا ضروری عنصر قرار دیا۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے خواتین کی دینی تعلیم وتربیت کے لیے بہشتی زیور نامی کتاب لکھی۔اس کے پیش لفظ میں کتاب لکھنے کی غرض وغایت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ایک مدت سے ہندوستان کی عورتوں کے دین کی تباہی دیکھ دیکھ کر قلب دکھتا تھا۔اوراس کے علاج کی فکر میں رہتا تھا، اور زیادہ وجہ فکر کی یہ تھی کہ یہ تباہی صرف ان کے دین تک محدود نہیں تھی، بلکہ دین سے گزر کر ان کی دنیا تک پہنچ گئی تھی اوران کی ذات سے گزر کران کے بچوں بلکہ بہت سے آثار سے ان کے شوہروں تک اثر کرگئی تھی۔اور جس رفتار سے یہ تباہی جاری تھی اس کے اندازہ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اگر چندے اور اصلاح نہ کی گئی تو شائد یہ مرض قریب قریب لا علاج ہو جائے۔اس لیے علاج کی فکر زیادہ ہوئی اور سبب اس تباہی کا، بالقاء الٰہی اور تجربہ اور دلائل اور خود علم ضروری سے محض یہ ثابت ہوا کہ عورتوں کا علوم دینیہ سے ناواقف ہونا ہے، جس سے ان کے عقائد، ان کے اعمال، ان کے اخلاق، ان کا طرز معاشرت سب برباد ہورہا ہے، بلکہ ایمان تک بچنا مشکل ہے۔کیونکہ بعضے اقوال وافعال کفریہ تک ان سے سرزد ہوجاتے ہیں اور چونکہ بچے ان کی گودوں میں پلتے ہیں، زبان کے ساتھ ان کا طرز عمل، ان کے خیالات بھی ساتھ ساتھ دل میں جمتے جاتے ہیں۔جس سے دین تو ان کا تباہ ہی ہے، مگر دنیا بھی بےلطف وبدمزہ ہوجاتی ہے۔اس وجہ سے کہ بداعتقادی سے بداخلاقی پیدا ہوتی ہے اور بداخلاقی سے بداعمالی اور بداعمالی سے بد معاملگی، جو جڑ ہے تکدر معیشت کی۔

مولانا تھانوی نے واضح کیا کہ اسلام کے نزدیک عورت بھی اس قدر اہم ہے، جتنا کہ مرد ہوسکتا

ہے۔ اگر عورت کو کم تر، کم فہم اور کم عمل سمجھا جاتا ہے، تو اس کی وجہ جاہلانہ رسومات و رواج، اور تصورات ہیں۔ یہ اسلام کا حکم نہیں ہے۔ مولانا نے اگرچہ مذہبی اصلاح کو اصل موضوع بنایا ہے، مگر ساتھ ساتھ معاشرتی اصلاح پر بھی توجہ دی کیونکہ ان کے خیال میں اَن پڑھ عورت کی وجہ سے پورا خاندان جہالت، زوال اور انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ گھر میں ہونے والے واقعات کے اثرات بہرحال پورے معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں۔ اصلاح و تربیت کا آغاز عورت سے ہونا چاہیے۔ معاشرتی رسومات کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے:

> گھر میں برادری کنبے کی عورتیں جمع ہو کر لڑکی کو ایک کونہ میں قید کر دیتی ہیں، جس کو مایوں بٹھلانا، اور مانجھے بٹھلانا کہتے ہیں۔ اس کے آداب یہ ہیں کہ اس کو چوکی پر بٹھا کر اس کے داہنے ہاتھ پر کچھ بٹنا رکھتی ہیں، اور گود میں کچھ کھیل بتاشے بھرتی ہیں۔ اور کچھ کھیل بتاشے حاضرین میں تقسیم ہوتے ہیں۔ یہ رسم بھی چند خرافات ملا کر بنائی گئی ہے۔ اوّل اس کے علیحدہ بٹھانے کو ضروری سمجھنا، خواہ گرمی ہو، حبس ہو۔ دنیا بھر کے طبیب بھی کہیں کہ اس کو کوئی بیماری ہو جائے گی، کچھ ہی ہو، مگر یہ فرض قضا نہ ہونے پائے۔ پھر اس میں بھی وہی بے حد پابندی کی برائی موجود ہے۔ اور اگر اس کے بیمار ہو جانے کا اندیشہ ہو تو دوسرا گناہ ایک مسلمان کو ضرر پہنچانے کا ہوگا، جس میں ماشاء اللہ ساری برادری بھی شریک ہے۔ دوسرے بلا ضرورت چوکی پر بٹھلانا، اس کی کیا ضرورت ہے، کیا فرش پر اگر بٹنا ملا جائے گا تو بدن میں صفائی نہ آئے گی، اس میں بھی وہی بے حد پابندی جس کا خلاف شرع ہونا کئی دفعہ معلوم ہو چکا ہے۔ تیسری دہنے ہاتھ پر بٹنا رکھنا اور گود میں کھیل بتاشے بھرنا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی ٹوٹکا، اور شگون ہے۔ اگر ایسا ہے تب تو شرک ہے اور شرک کا خلاف شرع ہونا کون مسلمان نہیں جانتا۔

سید ممتاز علی (۱۸۶۰ء-۱۹۳۵ء)

اردو مجلہ ''تہذیب النسواں'' کے مدیر لاہور کے سید ممتاز علی کا خواتین کی اصلاح کے لیے نمایاں کام ہے۔ انھوں نے رسالے کا اجراء ۱۸۹۸ء میں کیا اور حقوق النسواں کے حوالے سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اور یہ بتایا کہ عورتوں کو اسلام نے کیا کیا حقوق دیئے ہیں۔ انھوں نے اعتراض کرنے والے مقامی عیسائی مشنریوں پر واضح کیا کہ ہندوستان میں عورتوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا ہے وہ معاشرتی

جبر، دین سے ناواقفیت اور سیاسی مرکزیت کے توڑ پھوڑ کی بدولت ہے۔

سید ممتاز علی کا کہنا ہے کہ خدا کی نگاہ میں مرد اور عورت یکساں ہیں۔ مردوں کی برتری کا تصور نسلاً بعد نسلاً بغیر کسی بنیاد کے رائج ہے۔ وہ مغربی تہذیب کو یکسر مسترد کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ نظام زندگی چلانے کے لیے ہدایت قرآن اور اسوہ رسول کافی ہیں۔ تاہم وہ اسلامی قانون کی تشکیل نو اور بدعات و خرافات کو یکسر ختم کر دینے کے حامی تھے۔ خواتین کی تعلیم کے سلسلے میں وہ صرف گھریلو امور کے بارے میں بنیادی تعلیم دینے کے تصور سے آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دینی تعلیم کے علاوہ عورتوں کو سیاسی اور معاشی حقوق کا تصور دینا چاہیے۔ برصغیر میں پردے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"Purdah - as it is practiced among Muslims in India - goes far beyond anything that the Shariat intended."

یعنی برصغیر کے مسلمان جس قسم کے پردے کے عادی ہیں وہ شریعت سے کہیں آگے کی چیز ہے۔ انہوں نے اس خیال خام کی نفی کی کہ عورتوں کے لیے زیادہ مہر بندھوانا چاہیے تاکہ مرد اسے طلاق نہ دے سکیں۔ اس کی بجائے وہ زوجین کے باہمی افہام وتفہیم پر زور دیتے ہیں۔ مردوں اور عورتوں کے حقوق و فرائض پر بحث کرنے کے بعد ممتاز علی کہتے ہیں کہ:

> عوام الناس میں تبدیلی کی صرف بات کرتے رہنا مفید نہیں ہے، افراد کو اپنی انفرادی زندگی میں مثال قائم کرنی چاہیے۔ تعلیم یافتہ ابنائے اسلام، سرکاری ملازمین، پیشہ ور ماہرین اور وہ لوگ جو حکومت عوام کے قائل ہیں، ان سب کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ اگر وہ اپنی عورتوں کو زیادہ تعلیم دلانے اور اس کے لیے انتظامی بندوبست کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، تو آخر حکومت سے زیادہ اختیارات کس طرح مانگ سکتے ہیں۔ (جبکہ عین اسی زمانے میں مسلمان، حکومت سے وسیع تر اختیارات طلب کر رہے تھے،) شریعت نے جو حقوق عورتوں کو دیے ہیں، تعلیم یافتہ لوگ اس کام کا بیڑا اٹھائیں۔

برصغیر کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے انھوں نے نشان دہی کی کہ جو عورتیں اپنے شوہروں کے ظلم و ستم اور جور و جبر کا شکار ہیں انھیں شریعت کے مطابق خلع حاصل کرنا چاہیے اور مسلم معاشرے کو اس اہم شرعی حکم کے اتباع میں سرگرمی دکھانی چاہیے۔

دینی اور اصلاحی نقطہ نظر سے خواتین کی تربیت اور انھیں حقوق دلوانے کی غرض سے ان مصلحین کی فکری کاوشوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان مسائل پر قانونی پہلوؤں سے بھی غور ہونے لگا۔ بمبئی سے تعلق رکھنے والے نوجوان بیرسٹر محمد علی جناح نے اسلام کے نظام قانون کو سمجھا خواتین کی پست حالی کا صحیح شعور حاصل کیا، اور قانون کے ذریعے ان کے حقوق کی حفاظت کی جنگ لڑی کیونکہ وہ لیجسلیٹیو کونسل کے ممبر بھی تھے، اس لیے ان کی آواز کونسل کے ایوانوں میں بھی گونجتی تھی۔ انھوں نے ۱۹۱۳ء کا قانون وقف (Waqf Validating Act 1913) لڑا اس کے علاوہ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۴۰ء تک ایک طویل قانونی جنگ ہے جو محمد علی جناح نے بہت سی مخالفتوں کے باوجود لڑی۔ اس پر برصغیر کے تمام سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے نمائندوں کی تائید انھیں حاصل تھی۔ کوزلوسکی (ایک مصنف جو انہی قوانین پر بحث کرتا ہے) کا کہنا ہے کہ جناح، سر سید احمد خان سے کہیں زیادہ واضح طور پر اسلامی قانون کا فہم رکھتے تھے۔

اس ساری قانونی جنگ کے نتیجے میں عورتوں کو بہت زیادہ حقوق تو نہ ملے، تاہم قانونی ڈھانچے میں مسلم خواتین کے حقوق کی قدر و قیمت واضح ہوگئی، اس کے کچھ نکات یہ ہیں:

۱۔ عورتوں کو اسلام نے جو حقوق دیے ہیں، اس کے پیدائشی حقوق ہیں عطائی نہیں۔

۲۔ ریاست کے اندر مردوں اور عورتوں کے حقوق واضح طور پر الگ الگ متعین ہوئے۔

۳۔ بچپن کی شادی کی روک تھام کا قانون وضع کیا گیا، جو تمام قوموں (ہندوستان کے مختلف مذاہب کے لوگوں) پر لاگو ہوتا تھا۔

۴۔ تعدد ازواج، یک طرفہ طلاق کے خلاف بھی ۱۹۱۸ء میں قرارداد منظور ہوگئی۔

۵۔ پراپیگنڈے اور آواز بلند کرنے کے نتیجے میں طلاق تفویض اور دوسری شادی کی صورت میں بھی عورت کو مہر دینے کی پابندی میں فقہی رعایتیں واضح ہوگئیں۔

۶۔ عورتوں کو وراثت میں شریعت کے مطابق حق نہ دینے کے روایتی رسم و رواج کے خلاف احتجاج کیا گیا۔

۷۔ وقف کی املاک رشتہ داروں کا نہیں بلکہ مساکین (خصوصاً) خواتین کا ورثہ ہیں، تسلیم کرلیا گیا۔

الغرض الگ الگ پلیٹ فارم، اور مکتبہ ہائے فکر وسیاست سے تعلق رکھنے والے ارباب فکر ونظر اور احباب سیاست کے درمیان ایک غیر رسمی الحاق بن گیا۔ اور وہ سب کے سب عورتوں کے حقوق کی اسلامی نوعیت پر متفق تھے۔

عورتوں کے لیے حقوق تک کی جنگ ان کے مردوں نے لڑی۔ کیونکہ برصغیر کی عورتیں مردوں کے زیر سایہ رہنے کی عادی تھیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس ساری فکری، عملی اور قانونی تگ و دو میں ایک بھی عورت کا نام نمایاں نظر نہیں آتا۔

مگر قابل توجہ بات یہ ہے کہ بیسویں صدی میں بھی جو قانونی اصلاحات زیرغور ہیں، (وہ گزشتہ صدی کی تحریک کے سبب ہی ہیں۔) ان سب سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورتوں کے لیے حقوق تک کی جنگ ان کے مردوں نے لڑی۔ کیونکہ برصغیر کی عورتیں مردوں کے زیر سایہ رہنے کی عادی تھیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس ساری فکری، عملی اور قانونی تگ ودو میں ایک بھی عورت کا نام نمایاں نظر نہیں آتا۔ نیز مذکورہ بالا مصلحین نے عورتوں کے حقوق کی جنگ پوری طرح نہیں لڑی، لیکن یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ان مصلحین کا اصل موضوع عورتوں کا معاشرتی مقام ومرتبہ اور اسلام سے رجوع تھا۔ اور عورتوں کے حقوق کی بات اور حقوق دلانے کا قانونی کام اس سلسلے کا ایک ضمنی پہلو بن گیا۔ اصل میں مروج رسومات کی اصلاح اور نہ ملنے والے حقوق کی شناخت اور حصول کے لیے خود عورتوں کو آگے بڑھنا چاہیے۔